ڈاکٹر سلیم اختر

# پاکستان اور ایران کے ثقافتی اور تخلیقی روابط

آج دنیا "عالمی گاؤں" میں تبدیل ہو رہی ہے تو ایسے میں دو ممالک کے تہذیبی، تمدنی، ثقافتی، جمالیاتی اور تخلیقی روابط پر بحث کسی حد تک بے سود نظر آتی ہے کہ اب دنیا بھر کے ممالک میں اس نوع کے روابط عام ہونے کے ساتھ ساتھ بعض اوقات تو فوری بھی ثابت ہوتے ہیں۔ فیشن سے لے کر فلم تک اور فلسفہ سے لے کر فرنیچر تک ـــــ دائرہ اور دائرۂ اثرات کا لامتناہی سلسلہ ہے۔

ماضی میں عمومی روابط کے فقدان کے باعث ممالک اور ان کی تہذیب و ثقافت "سیاست" کی صورت میں بیرونی اثرات سے آزاد، ایک لحاظ سے خود مختار رہتی کہ جب بیرونی حملہ آور آتے تو وہ بستیاں ویران کر دیتے، تہذیبی آثار برباد کرتے اور ثقافتوں کے چراغ گل کرتے۔ تاجر آتے تو ممالک غیر کے پارچات، زیورات اور نوادر ساتھ لاتے مگر یہ خرید و فروخت انفرادی سطح پر ہوتی تھی۔ اس لیے کسی تہذیب و ثقافت پر ان کے مجموعی اثرات نہ ہوتے۔ کبھی کبھار دیس دیس کی سیر کرتا کوئی سیاح آ جاتا جو اچنبھے میں ڈالنے والے واقعات قلمبند کرتا تو وہ عجیب و غریب اور دل فریب معلوم ہوتے۔ ان حالات میں، ماضی بعید میں جا کر، دو ملکوں کے تہذیبی، ثقافتی، تخلیقی اور جمالیاتی روابط کی منتشر کڑیاں تلاش کرنا آسان کام نہیں لیکن ایران اور پاکستان کے ثقافتی اور تخلیقی روابط کا سراغ لگانا اس لیے آسان ہو جاتا ہے کہ جغرافیائی قرب کے ساتھ ساتھ فارسی اور اسلام کے اشتراک کی وجہ سے دونوں میں جو ثقافتی یگانگت ملتی تھی، اس کی بنا پر

برصغیر کو بعض امور اور بالخصوص تخلیقات کے لحاظ سے ایرانی ثقافت کی توسیع قرار دیا جا سکتا ہے۔

آج جو خطہ پاکستان کے نام سے موسوم ہے، علم بشریات کے ماہرین کی جدید ترین تحقیقات کی رو سے یہ خطہ انسان کا اولین گہوارہ ثابت ہوتا ہے۔ ۱۹۶۷ء میں پوٹھوہار سے جو مجرات (Fossils) ملے، ان سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ سوا چھ کروڑ سال پہلے اس خطے میں حیات انسانی کا آغاز ہو چکا تھا۔ اسی ضمن میں یحییٰ امجد "تاریخ پاکستان" (ص:۸۶) میں رقم طراز ہیں:

> "دستیاب شواہد کے ارتکاز کے پیش نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ نسل انسانی کی جنم بھومی پاکستان ہے اور پاکستان کے اندر پنجاب ہے۔"

پانچ دریاؤں کی سرزمین اور اس کے ساتھ وادی سندھ برصغیر میں نسل انسانی کے اولین ظہور کے ساتھ ساتھ قدیم ترین ثقافتی آثار کی بھی امین ہے۔ برصغیر کی تاریخ بالعموم آریاؤں کی آمد سے شروع کی جاتی ہے، حالانکہ آریاؤں سے پہلے بھی یہاں منڈا، کول، دراوڑ، سنتھال وغیرہ کئی نسلیں آباد تھیں۔ رشید اختر ندوی نے "ارض پاکستان کی تاریخ" میں سرہولڈچ کی تالیف "انڈیا" کے حوالہ سے لکھا ہے کہ "ڈراویڈن توران کے رہنے والے تھے اور انہیں بلوچستان میں داخل ہوتے وقت کچھ زیادہ مسافت طے کرنا نہیں پڑی تھی۔" (ص:۸۸)

آریاؤں کی اسی خطہ میں آمد کے سلسلے میں کی گئی تحقیقات کے نتیجے میں اب یہ عام طور سے تسلیم کیا جاتا ہے کہ یہ وسط ایشیا (موجودہ ازبکستان) سے نکلے اور تقریباً ڈیڑھ دو ہزار برس قبل یہاں وارد ہوئے۔ کچھ یہاں آباد ہوئے، کچھ ایران پہنچے اور کچھ یورپ میں آباد ہوئے۔ آریاؤں کا قد لمبا، رنگ سفید اور ناک ستواں تھی۔ اسی لیے یہ خود کو مقامی سیاہ فاموں سے برتر اور ممتاز سمجھتے تھے اور یہیں سے نسلی برتری پر مبنی اس تعصب کا سراغ لگایا جا سکتا ہے

جو سفید فام کی گویا گھٹی میں پڑا ہے۔ اگرچہ ماہرین اب کسی بھی "آریہ نسل" کو تسلیم نہیں کرتے لیکن کوسامبی کا خیال ہے کہ برصغیر میں آنے والے آریاؤں میں کوئی نہ کوئی ایک گروہ ایسا تھا جو اپنے تئیں نسلی معنوں میں آریہ کہتا تھا۔ فارس کے بادشاہ داریوش اول نے اپنی لوح مزار کے لیے ۴۸۶ق م میں یہ عبارت کنندہ کروائی تھی:

"پارسو، پارسیہا پتھرا، آریہ، آریہ چھترا"

یعنی "پارسی' پارسی کا بیٹا' آریہ' آریہ نسب" (بحوالہ "تاریخ پاکستان" ص:۶۱۱)

انسانی معاشرہ میں زبان ابلاغ کا اولین ذریعہ ہے۔ اسی لیے ثقافتی اور بالخصوص تخلیقی آثار اور اثرات کی بحث لسانیات کے دائرہ کار میں آجاتی ہے' لسانی محققین نے آریاؤں کی اور کے بعد برصغیر کے مختلف خطوں میں لسانی تغیرات اور لسانی امتزاجات اجاگر کرنے میں جو کاوشیں کیں ان کے نتیجے میں سنسکرت اور قدیم فارسی زبان کے باہمی اثرات پر بطور خاص روشنی ڈالی گئی۔ اس ضمن میں دونوں زبانوں کے مشترک المعانی الفاظ کے تجزیہ و تحلیل سے دونوں زبانوں کی مشترک اساس کا سراغ لگانے کی کوشش کی گئی۔ مولانا محمد حسین آزاد نے ۱۸۸۷ء میں "سخن وران فارس" لکھ کر تقابلی لسانیات سے سنسکرت اور فارسی کو مشترک الاصل ثابت کیا۔ یہی نہیں مستشرقین نے تو یہ ثابت کیا ہے کہ پشتو زبان کا تعلق مشرقی ایران میں مستعمل زبانوں سے ہے اور اس کی بنیاد قدیم ایرانی زبان "آوستا" پر رکھی گئی ہے۔ بعد میں دوسری زبانیں خاص طور سے عربی' فارسی اور سنسکرت اس پر اثر انداز ہوئیں"—— کچھ عرصہ پہلے سیستان (ایران) میں ایک قدیم کتبہ ملا تھا' جس کے متعلق آثار قدیمہ کے ماہرین کا خیال ہے کہ وہ تین سے ساڑھے تین ہزار سال قبل مسیح کا ہے اور اس میں فروشتی رسم الخط میں جو تین جملے لکھے ہیں' وہ بالکل پشتو زبان کے ہیں' وہ جملے یہ ہیں:

نہ اڈیک یم (نہ میں رزیل ہوں)    نہ دروزن یم (نہ میں جھوٹا ہوں)
نہ زور کڑے یم (نہ میں جابر ہوں)    (مقالہ مطبوعہ ماہ نو' لاہور' اگست ۱۹۹۷ء)

ادھر بلوچی کے بارے میں کی گئی لسانی تحقیقات بھی اس زبان کا رشتہ فارسی سے جوڑتی ہیں۔ ڈاکٹر عبدالرزاق ماہر کے مقالہ: "بلوچی زبان و ادب کی تاریخ" کا آغاز اسی دعویٰ سے ہوتا ہے کہ گریہ سن کے حوالہ سے ڈاکٹر زور بلوچی زبان کو ہند آریائی گروہ میں قدیم فارسی کے بعد فارسی یا ایران کی جنوب مشرقی شاخ قرار دیتے ہیں جبکہ ۱۸۷۷ء میں میجر نوکلر کا خیال تھا کہ بلوچی آریائی زبان کی ایک شاخ ہے اور پہلوی کی بہن معلوم ہوتی ہے۔ ایک ایسی شاخ جو یقیناً پہلوی کی طرح اور اس کے دوش بدوش قدیم فارسی سے نکلی ہوئی ہے اور مکران میں پھلی پھولی اور پروان چڑھی ہے۔ جبکہ جدید لسانی تحقیقات کی رو سے بلوچی جنوب مغربی ایرانی شاخ سے متعلق ہے جیسا کہ الفن بائن کہتا ہے۔ (مقالہ مطبوعہ "ماہ نو" لاہور، اگست ۱۹۹۷ء)

ماضی کی سنسکرت اور حال کی پشتو اور بلوچی زبانوں کے فارسی سے لسانی روابط سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ماضی بعید میں موجود خطے اور ایران میں کسی نہ کسی طرح کا لسانی تعلق رہا، ایسا تعلق جو سرسری اور سطحی ہونے کے برعکس گہرا اور دور رس ثابت ہوا۔

اردو کے آغاز اور مولد کی بحث میں الجھے بغیر اتنا عرض کر دینا کافی ہے کہ شمالی ہند کے مقابلہ میں جنوبی ہند میں اس کے تخلیقی نقوش پہلے اجاگر ہوئے مگر اس اردو پر سنسکرت اور مقامی بولیوں کے الفاظ و محاورات کا زیادہ اثر تھا۔ شاید اسی لیے دہلی میں اس عہد کے مشہور بزرگ صوفی سعد اللہ گلشن (وفات: ۱۷۲۸ء) نے ولی (وفات: ۱۷۰۷ء) کی دکھنی لب و لہجہ کی غزلیں سن کر انہیں یہ مشورہ دیا:

ایں ہمہ مضامین فارسی کہ بیکار افتادہ اند در ریختہ
خود بکار ببر از تو کہ محاسبہ خواہد گرفت
(نکات الشعرا، ص: ۹۱)

اگرچہ بعض محققین اس روایت کو درست تسلیم نہیں کرتے مگر یہ بات اگر درست سمجھی جائے تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ فارسی کے زیر اثر اردو غزل نے اسلوب کی فنی جمالیات حاصل

کرلی، یوں کہ پھر مفرس اسلوب ہی فصاحت و بلاغت کا معیار قرار پایا، جو غالب اور اقبال کی شاعری میں نقطہ عروج پر نظر آتا ہے۔

خود ولی نے بھی اپنی ایک غزل میں فارسی شعراء کو اس اسلوب میں خراج تحسین پیش کیا ہے:

ترا مکھ مشرقی، حسن انوری، جلوہ جمالی ہے
نین جامی، جبین فردوسی، ابرو ہلالی ہے
ریاض فہم و گلشن طبع و دانا دل، علی فطرت
زباں تیری، فصیحی و سخن تیرا زلالی ہے
نگہ میں فیضی و قدسی سرشت طالب و شیدا
کمالی بدر، دل اہل و انکھیاں سوں غزالی ہے
تو ہی ہے خسرو روشن ضمیر و صائب شوکت
ترے ابرو، یہ مجھ بیدل کو طغرائے و ہالی ہے
ولی تجھ قدو ابرد کا ہوا ہے شوقی و مائل
تو ہر اک بیت عالی ہور ہر اک مصرع عالی ہے

وسط ایشیا سے نکلے جن آریاؤں نے اس خطہ پر تسلط جمایا ان ہی کے "کزن" مقامی آبادی سے نبرد آزمائی کے بعد ایران پر قابض ہو گئے، ان ہی میں سے ایک گروہ نے جنوبی ایران کے علاقہ پارس پر قبضہ کیا اور اس نسبت سے "پارسی" اہل پارس کہلایا۔ بعد میں اس علاقہ نے فارس اور اسی نسبت سے زبان نے فارسی کا نام پایا۔

قدیم عہد میں جس بادشاہ نے ایران کو صحیح معنوں یں ایک بڑی اور طاقت ور سلطنت بنایا وہ تھا کوروش اعظم (۵۲۹-۵۵۰ ق م)۔ اس اولوالعزم بادشاہ نے میڈیا، بابل، نینوا کو فتح کیا، اس کے بعد دارایوش (دارائے اعظم، ۴۸۶-۵۲۵ ق م) نے سندھ اور مقدونیہ تک

سلطنت کی توسیع کر دی۔ قدیم ایران کی تاریخ اور تہذیب و تمدن کے لحاظ سے یہ سلطنت شاندار اور بارعب تھی مگر ۳۳۱ ق م میں اس خاندان کا آخری بادشاہ دارا (سوم) سکندر اعظم کے ہاتھوں شکست کھا کر مارا گیا۔

قبل اسلام کے ایران کی اپنی مخصوص تہذیب اور ثقافت تھی۔ ادھر ادبیات کا بھی آغاز ہو چکا تھا۔ اس مقصد کے لیے جو زبان استعمال ہوتی تھی، وہ تھی "قدیم فارسی"۔ جو ڈھائی ہزار سال کا طویل عرصہ گزر جانے کے بعد آج بھی کتبوں کی صورت میں محفوظ ہے۔ یہ وہ کتبے ہیں جو کوروش اعظم اور دارائے اعظم کے حکم سے پہاڑوں پر کندہ کرائے گئے تھے۔ ان میں ایک بہت بڑی یادگار بے ستون ہے جو دارائے اعظم نے کندہ کرایا تھا۔ بے ستوں وہی پہاڑ ہے جس کی وادی میں آج بھی داستان فرہاد کی گونج سنائی دیتی ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی کتبے ملتے ہیں جن میں نقش رجب، نقش رستم اور تخت جمشید خاص طور سے بہت اہم ہیں۔" (بحوالہ "ادب نامہ ایران" ص: ۵-۴)۔ مگر مولانا ابوالکلام آزاد نے "غبار خاطر" میں اس کی تردید کرتے ہوئے یہ صراحت کی ہے کہ یہ "بے ستون" نہیں، بلکہ "بہ ستون" (بہستان یا باغستان) ہے۔ قدیم فارسی میں "باغ" خدا یا دیوتا کو کہتے تھے یعنی یہ مقام "خداؤں کی جگہ" ہے۔ دنیائے علم ان کتبوں، ان کی زبان اور اس کی اہمیت سے مدتوں بے خبر رہی حتیٰ کہ ۱۸۴۶ء میں سر ہنری رالنسن (Sir Henry Rawlinson) نے بڑی مشکل سے بے ستون کے کتبہ کو Decipher کر لیا۔ خط میخی (Cuneiform) کا یہ کتبہ تین قدیم زبانوں: فارسی، ایلمی اور بابلی میں کندہ کرایا تھا۔ (بحوالہ: "فن تحریر کی تاریخ" ص: ۵۹-۵۸)

جہاں تک خود فارسی زبان کا تعلق ہے تو اس کے آغاز کے بارے میں وثوق سے کچھ کہنا مشکل ہے تاہم اس کے رسم الخط کی حد تک اتنا طے ہے کہ "چھٹی اور چوتھی صدی ق م کے درمیان فارس میں پیکانی خط مستعمل تھا۔ اس میں کل ۴۱ نشانات کام آتے تھے۔" (حوالہ سابق، ص: ۷۵)۔ "فارسی کے پیکانی حروف کی ایجاد کا زمانہ بھی مشکوک ہے۔ بعض یکخسرو یا

سیروس کبیر کا عہد (۵۵۰-۵۲۹ ق م) ظاہر کرتے ہیں اور بعض دارا یا داریوش اعظم (۴۸۶-۲۵۱ ق م) کا۔" (حوالہ سابق، ص: ۷۷) تاریخ ادبیات ایران کے مولف شفیق کا خیال ہے کہ قدیم اہل ایران خط میخی کے علاوہ ایک اور خط بھی استعمال کرتے تھے جسے خط اوستی کہتے ہیں، یہ خط سامی رسم الخط سے لیا گیا تھا۔ ممکن ہے، جس زمانے میں خط میخی پتھر پر کندہ کرنے کے کام آتا تھا، اس زمانے میں خط اوستی ہاتھ سے لکھنے کے کام آتا ہو۔" (بحوالہ "ادب نامہ ایران" ص: ۱۲)

اور پھر عرب سے وہ صحرا نشین اٹھے جنہوں نے مشرق کا نقشہ ہی تبدیل نہ کیا بلکہ تہذیب و تمدن کے پیمانے بھی تغیر آشنا کر دیے۔ ایران میں اسلام پھیلا تو زبان و ادب میں بھی اس کے ہمہ گیر اثرات سے طرح نو استوار ہوئی۔ قرآن شریف اور عبادت کی زبان عربی تھی۔ لہٰذا آہستہ آہستہ تمام مقبوضات میں عربی کا چلن ہو گیا۔ ایسے میں فارسی زبان اور اس کے حوالہ سے شاعری کا انفرادی تشخص برقرار رہا تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ فارسی زبان اور شاعری میں اتنی تخلیقی توانائی موجود ہوگی کہ اس نے نہ صرف عربی کا مقابلہ کیا بلکہ اس کے ساتھ ہی شاعری (بالخصوص غزل اور مثنوی) کی صورت میں دیگر اقوام کو بھی متاثر کیا۔

اس موقع پر غزل کا خصوصی تذکرہ ہونا چاہیے کہ ایرانیوں کی مانند یہ برصغیر کے شعراء کی بھی محبوب صنف رہی ہے۔ یہ ایرانی قوم کی تخلیقی جینئس کا کمال ہے کہ عربی قصیدہ کی تشبیب کو غزل کی صورت میں جداگانہ صنف سخن کے طور پر نہ صرف متعارف کرایا بلکہ اس میں وہ کمال پیدا کیا کہ سات سمندر پار جرمنی کا گوئٹے بھی اس کے سحر کا اسیر ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر محمد صدیق شبلی اس سلسلہ میں لکھتے ہیں کہ "ایرانی فضلاء (استاد جلال ہمائی، دکتر صفا، دکتر مجوب موتمن) غزل کو قصیدے سے الگ کرنے کا سہرا فارسی شعراء کے سرباندھتے ہیں۔ ان کے خیال میں فارسی کے اولین ادوار (صفاری و سامانی) ہی میں فارسی غزل وجود میں آ چکی تھی۔ صفاری اور سامانی دور کے لاکھوں اشعار میں سے صرف تین ہزار کے قریب اشعار باقی بچے ہیں اور یہ بھی لغت، تذکرہ اور تاریخ کی کتب سے جمع کیے گئے ہیں۔" ڈاکٹر شبلی اسی سلسلہ میں مزید

رقم طراز ہیں ''ردیف خالص ایرانی اضافہ ہے اور وہ اضافہ فقط غزل ہی کے اشعار میں نہیں، وہ ہر صنف کے اشعار میں ترنم افزائی کر رہا ہے۔ (بحوالہ: ''علامہ اقبال کی فارسی غزل'' مقدمہ، ص:۴۲)

یہ ہے وہ تناظر جس میں اس خطہ کے مخصوص تاریخی حالات سے مشروط ایرانی ثقافت اور فارسی تخلیقات کے اثرات کا مطالعہ ممکن ہے۔

محمد بن قاسم (۷۱۲ء) سے سندھ میں مسلمانوں کی عملداری کا آغاز ہوتا ہے، لیکن غزنوی، خلجی، تغلق، لودھی خاندانوں کے حکمران شمالی ہند سے لے کر دکن اور بنگال تک حکومت کی حدود میں وسعت پیدا کر چکے تھے۔ اگرچہ محمود غزنوی کے زمانہ سے ہی یہاں کی مقامی آبادی فارسی سے دلچسپی کا اظہار کر رہی تھی مگر سکندر لودھی (تخت نشینی: ۸۹۴ھ) ہی کے عہد میں اس ضمن میں باضابطہ کوشش کی گئی، چنانچہ مولانا عبدالسلام ندوی کے بقول ''اب تک ہندوستان میں فارسی زبان کی تعلیم کا رواج نہیں تھا، لیکن اس کے زمانے سے ہندوستان میں بھی فارسی زبان کی تعلیم کا رواج ہوا۔'' اس سلسلہ میں انہوں نے تاریخ فرشتہ سے اقتباس بھی درج کیا ہے (بحوالہ: ''ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی کارنامے'' ص:۱۹۷)

مولانا عبدالسلام اس کتاب میں شامل مقالہ ''تعلیم کی ترقی'' میں مزید رقم طراز ہیں کہ مسلمان حکمرانوں نے جو مدارس قائم کیے تھے ''ان میں معمولی نوشت و خواند اور فارسی زبان کی ابتدائی تعلیم ہوتی تھی، اس لیے ہندو بھی اس میں تعلیم حاصل کر سکتے تھے اور قیاس یہ ہے کہ سکندر لودھی کے زمانے میں جب ہندوؤں نے فارسی زبان کی تعلیم شروع کی تو انہی مکاتب سے فائدہ اٹھایا ہو گا۔'' (ایضاً، ص:۲۲۵) ''فارسی زبان کی تعلیم نے جو سکندر لودھی کے زمانے سے ہندوؤں میں پھیلی ہندوؤں کی اخلاق و معاشرت میں وہی تبدیلی پیدا کی جو انگریزوں کے زمانے میں انگریزی زبان نے پیدا کر دی تھی۔ یہ تبدیلی فارسی زبان کی اس تعلیم کا اثر تھی جو ہندو اور مسلمان، مکتبوں میں پہلو بہ پہلو بیٹھ کر مسلمان استادوں سے حاصل کرتے تھے۔ اس

غیر متعصبانہ طریقے سے پہلے ہندوؤں نے فارسی زبان کی تحصیل و تکمیل کی' اس کے بعد انہوں نے مسلمانوں کے رسم و رواج اور وضع و لباس کی تقلید کی۔ (ایضاً' ص:۲۲۸)

اگرچہ مذہبی مقاصد کے لیے عربی کا سکہ چلتا رہا اور اپنے اپنے طور پر مقامی زبانیں بھی کار آمد رہیں مگر بیشتر درباروں میں سرکاری کام فارسی ہی میں ہوتا رہا۔ چند صدیوں بعد' ۱۸۵۷ء کے بعد جس طرح مقامی لوگ ملازمت کی خاطر حکمرانوں کی انگریزی زبان سیکھنے پر مجبور ہوئے' اسی طرح مسلمانوں کی آمد اور حکومت کے بعد ہندوؤں نے بھی فارسی کی تعلیم و تحصیل کے بعد حکمرانوں کے درباروں میں رسوخ حاصل کیا۔ ''ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ'' میں ڈاکٹر سید عبداللہ نے اس ضمن میں جو کوائف فراہم کیے' ان کے بموجب محمود غزنوی اور اس کے جانشینوں کے دربار ہی میں نہیں' بلکہ اس کی فوج میں بھی ہندو تھے۔ (ص: ۴)۔ ڈاکٹر صاحب کے الفاظ میں ''اس عام انقلاب کا نتیجہ یہ ہوا کہ غزنوی عہد میں بھی شمالی ہندوستان میں فارسی زبان کا اچھا خاصا چرچا ہو گیا اور اس زمانے میں فارسی کے اچھے اچھے شاعر پیدا ہونے لگے۔'' (ص:۶) اس کے بعد سکندر لودھی بادشاہ کے عہد میں ہندوؤں میں فارسی تعلیم کے پھیلانے کی پہلی موثر کوشش ہوئی۔

مورخ فرشتہ کا بیان ہے کہ ''ہندوؤں نے اس عہد میں فارسی کی جانب توجہ منعطف کی۔ اس سے قبل انہوں نے اس کی طرف اقدام نہیں کیا تھا۔'' (ص:۷) ادھر شمالی ہند کے ساتھ ساتھ کشمیر کے ہندوؤں میں بھی فارسی عام ہونے لگی اور ''سپرو پنڈتوں نے سب سے پہلے اس میدان میں قدم رکھا۔'' (ص:۱۰)

بہرحال کشمیری ہندوؤں نے سلطان زین العابدین کے زمانے سے فارسی کی طرف توجہ کی اور رفتہ رفتہ ان کا درجہ کائستھوں کے برابر ہو گیا۔ چنانچہ مغلوں کے زمانے میں یہ قوم بھی اپنے اعلیٰ کلچر' فارسی دانی اور تہذیب کے لیے مشہور ہوئی۔'' (ص:۱۱)

ملتان سے چل کر سندھ پہنچیں تو وہاں بھی ایران کے تمدنی اثرات اور فارسی زبان نظر

ستی ہے' اگرچہ محمد بن قاسم عرب تھا مگر سید حسام الدین راشدی کے الفاظ میں "عربوں کے ساتھ ساتھ ایرانیوں کی بستیاں اور نو آبادیاں از سر نو سندھ میں آباد ہو گئیں۔ یہ فطری امر ہے کہ تجارتی نقصان اور آنے جانے والے قافلوں یا ان ایرانیوں کی وجہ سے جو عربوں کے ساتھ بس گئے تھے' ایرانی اثرات کے ساتھ ساتھ ایرانی زبان کو بھی یہاں متعارف ہونے کے مواقع ملے ہوں گے۔" (مقالہ بعنوان: "سندھ اور ایران کے تعلقات" (سیاسی اور ثقافتی) مطبوعہ "نقوش" خاص نمبر ۱۹۶۶ء)

فارسی دانی کے سلسلہ میں ہندوؤں کا اس لیے خصوصی تذکرہ ہوا کہ جب ہندو بھی مسلمانوں کی زبان سیکھنے کی طرف مائل ہوئے تو یہ اس "ہند ایرانی تمدن" کی استواری کا آغاز تھا جس کی علامت امیر خسرو قرار پاتے ہیں اور جس پر انہوں نے مثنوی "نہ سپہر" میں فخر کیا ہے۔ مغل سلطنت اور بالخصوص شہنشاہ اکبر نے شعوری طور پر اس مشترک تمدن کی پائدار اساس کی جگہ شاہ جہاں کے عہد میں اس تمدن کے جمالیاتی نقوش اجاگر ہوئے۔ دیکھا جائے تو ایک لحاظ سے مغل سلطنت کی حیات نو بھی ایران کی مرہون منّت ہے۔ ہمایوں جب شیر خاں سے شکست کھا کر' بھائیوں کی بے وفائی سے مایوس ہو گیا تو ایران کے شاہ طہماسپ صفوی کے دربار میں (۹۵۰ھ) اسے عافیت ملی اور اس کی مدد سے کھوئی ہوئی سلطنت دوبارہ حاصل کی۔ اپنے باپ کی مانند ہمایوں بھی فارسی کا شاعر تھا۔ مغل بادشاہ شاعر ہوں یا نہ ہوں مگر شعر پرست اور شعراء پرست یقیناً تھے۔ چنانچہ مغل درباروں میں شعراء اشعار کی داد پاتے اور قصائد پر مالا مال کیے جاتے۔ مغل عہد میں فارسی زبان اس کی شعری اصناف اور تہذیب و تمدن نہ صرف ایرانی رنگ میں رنگا جا چکا تھا بلکہ ایران اہل ہند کا اس حد تک آئڈیل بن چکا تھا کہ مرزا غالب اردو کے بجائے فارسی شاعری پر فخر کرتے تھے:

فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگزر از مجموعہ اردوئے بے رنگ من است

فارسی غزل کے زیر اثر مقامی شعراء نے غزل اور دیگر اصناف کی طرف توجہ دی اور بڑے بڑے باکمال اور صاحب اسلوب شعراء نے فارسی میں اپنے تخلیقی جوہر کا اظہار کیا۔ چنانچہ عرفی اور فیض سے چلیں تو امیر خسرو اور بیدل اور پھر اس صدی میں گرامی اور اقبال کی صورت میں تابندہ اسماء کی ایک کہکشاں نظر آتی ہے۔ یہاں کے شعراء حافظ، سعدی، نظیری، رومی، جامی، صائب، کلیم اور انوری کو آئیڈیل قرار دیتے رہے ہیں۔ بعض نے ان کا تتبع کیا، بعض نے اشعار کے تراجم کیے تو بعض نے نقالی ــــ مگر اس کے باوجود صاحب نظر اور صاحب اسلوب شعراء نے اپنی تخلیقی کاوشوں سے اپنے لیے جداگانہ اور ممتاز مقام حاصل کر لیا، اس حد تک کہ ان کی فکری کاوشوں، تخلیقی شعور اور اسلوب کی مخصوص جمالیات نے ''سبک ہندی'' کی صورت میں منفرد دبستان کی صورت اختیار کر لی۔ واضح رہے کہ فارسی زبان میں ترکی سوچ اور بالخصوص اسلوب سازی اور خیال بندی کی صراحت کے لیے سبک ہندی کی اصلاح وضع کی گئی تھی لیکن بعد میں اہل ہند کی فارسی شاعری اور بالخصوص غزل کے مخصوص انداز و اسلوب کے لیے یہ اصطلاح استعمال ہونے لگی اور پھر یہ اتنی مقبول ہو گئی کہ اہل ہند کے لیے مخصوص ہو کر رہ گئی چنانچہ استنبول یونیورسٹی کے ڈاکٹر خلیل طوق ار کے بموجب ''گیارھویں صدی ہجری کے اواخر میں جب ترکی اور ایران میں اس اسلوب کا دور ختم ہو رہا تھا، اس وقت کے ہندوستان میں اسی اسلوب کا طوطی بول رہا تھا۔ یہاں تک کہ تیرویں صدی ہجری اور بعد کے شعراء نیز مشہور مفکر و شاعر ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کے کلام میں بھی سبک ہندی کے اثرات نمایاں ہیں۔''
(مقالہ بعنوان: ''سبک ہندی'' مطبوعہ ''مجلّہ اقبال'' جولائی، اکتوبر ۱۹۹۷ء)

سبک ہندی کی اساس نازک خیال پر استوار تھی اور نازک خیالی کے اظہار کے لیے اسلوب کی مخصوص جمالیات درکار ہوتی ہے۔ اس مقصد کے لیے استعارہ، تمثیل، کنایہ اور دیگر لفظی و معنوی صنعتوں پر انحصار لازم ہوتا ہے۔ اس لیے سبک ہندی سے بعض شعراء کے لیے بعض اوقات شعر صرف اسلوب گری تک بھی محدود ہو کر رہ جاتا ہے اور یہی بالآخر وجہ نزاع

ثابت ہوا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ سبک ہندی جہاں اس کے خطے کے شعراء کی فارسی دانی کا مظہر تھا وہاں اس نے متعدد شعراء کی غزل کے لیے فنی اور فکری اساس بھی فراہم کی۔ جب مقامی تخیل فارسی اسلوب میں کامیابی سے گندھ جاتا تو اس سے اشعار کے ایسے نازک آبگینے تیار ہو جاتے جو جمالیاتی اور فکری نتیجہ کے حامل بھی ثابت ہوتے ہیں۔ سبک ہندی کو ہند ایرانی تخلیقی ثقافت کی کامیاب مثال قرار دیا جا سکتا ہے۔

یہ ناممکن ہے کہ ایرانی ثقافت اور فارسی گو تخلیقی شخصیات کا غلبہ ہو اور اس کے اثرات صرف شاعری تک ہی محدود رہیں اور عمارات، ملبوسات، اشیائے خورد و نوش اور طرز حیات ان کے اثرات سے تہی رہیں۔ چنانچہ موجودہ خطہ سمیت تمام ہندوستان کے تہذیبی آثار اور تمدنی مظاہر پر ایرانی تہذیب و تمدن کے گہرے اثرات کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

اسی ضمن میں مصوری اور خطاطی کا بطور خاص تذکرہ ہونا چاہیے مگر طوالت سے بچنے کے لیے تفصیلات سے گریز کیا جا رہا ہے۔ تاہم مزید معلومات اور کوائف کے لیے مندرجہ ذیل کتب سے رجوع کیا جا سکتا ہے:

۱۔ ”اسلام کا ہندوستانی تہذیب پر اثر“ از تارا چند، ڈاکٹر، دہلی، ۱۹۷۲ء
۲۔ ”بزم تیموریہ“ از سید صباح الدین عبدالرحمٰن، اعظم گڑھ، ۱۹۴۸ء
۳۔ ”بزم مملوکیہ“ از سید صباح الدین عبدالرحمٰن، اعظم گڑھ، ۱۹۵۷ء
۵۔ ”ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی کارنامے“ از معین الدین احمد ندوی (مرتب)، اعظم گڑھ، ۱۹۶۳ء

انگریز یہاں تجارت کرنے آئے اور پھر کس طرح سے مقامی حکمرانوں کی نااہلی اور اپنوں کی غداری کے باعث بالآخر وہ ہندوستان کے مالک بن بیٹھے۔ ان تاریخی حقائق سے سب آگاہ ہیں، اس لیے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ تاہم فارسی زبان، اس کی تدریس و تحصیل، اس میں تخلیقی کاوشوں اور دیگر تہذیبی اور تمدنی امور کے لحاظ سے انگریزوں کی عمل داری اس لیے اہم ہے

کہ ۱۸۳۶ء میں فارسی کی سرکاری حیثیت منسوخ قرار پائی جبکہ ۱۸۵۷ء کے بعد کے حالات میں سرسید کے بموجب انگریزی سیکھ کر سرکاری ملازمتیں حاصل کرنا ہی تقاضائے وقت تھا۔ بڑی محنت کے بعد "سخن وران فارسی" قلم بند کرنے والے مولانا محمد حسین آزاد بھی اس بات کا افسوس کرتے تھے:

> اے جوہر زبان کے پرکھنے والو! میں زبان انگریزی میں بالکل بے زبان ہوں اور اس ناکامی کا مجھے بھی افسوس ہے۔" (دیباچہ "نیرنگ خیال" ص:۱۰)

الغرض! انگریزی زبان اور مغربی ثقافت نے یہاں قدم جمالیے اور اس مضبوطی سے کہ اب لاکھ چاہو ان سے گریز ناممکن ہے اگرچہ اکبرالہ آبادی، مذہبی دانشور اور اہل بصیرت نے اس غلبہ کے خلاف قلمی جہاد جاری رکھا مگر بات نہ بن سکی۔ اس سے بڑھ کر اور کیا بدقسمتی ہو سکتی ہے کہ نصف صدی کو آزادی کے باوجود بھی اردو سرکاری زبان نہ بن سکی، فارسی کا تو تذکرہ بے کار ہے۔

برصغیر میں فارسی زبان کا چراغ گل ہونے سے پہلے علامہ اقبال آتے ہیں جن کی فارسی شاعری اس چراغ کی آخری بھڑک تھی کہ برصغیر میں کئی صدیوں کی شعری روایات علامہ اقبال کی صورت میں تخلیقی اوج اختیار کرلیتی ہیں۔

ٹی ایس ایلیٹ نے "کلاسیک" کا معیار یہ قرار دیا تھا کہ اپنی زبان کے تمام تخلیقی امکانات یوں بروئے کار لاتا ہے کہ پھر آنے والوں کے لیے اس سے بڑھ کر تخلیقی استعداد کا عملی مظاہرہ کرنا ممکن نہیں رہتا۔ اگر اس معیار پر علامہ اقبال کو پرکھیں تو برصغیر کی فارسی گوئی کی طویل اور توانا روایت میں وہ کلاسیک کا درجہ اختیار کر لیتے ہیں۔ علامہ اقبال کے تخلیقی جینئس کا یہ کمال ہے کہ انہوں نے برصغیر میں ہوتے ہوئے بھی سبک ہندی سے سروکار نہ رکھا بلکہ جداگانہ زبان اور منفرد اسلوب سے کام لیا اور اس میں وہ کمال پیدا کیا کہ خود اہل ایران نے

قدیم روایتی شاعرانہ اسالیب اور متاخرین کے رنگ سخن سے انہیں ممتاز اور منفرد کرنے کے لیے "سبک اقبال" کی اصلاح وضع کر ڈالی۔ چنانچہ ملک الشعراء بہار نے "سبک شناسی" میں علامہ اقبال کی شاعری کے تجزیاتی مطالعہ کے لیے ایک باب وقف کیا اور ان الفاظ میں منظوم خراج عقیدت پیش کیا:

بیدلے گر رفت اقبالے رسید      بیدلاں را نوبت حالے رسید
قرن حاضر خاصہ اقبال گشت      واحدے کز صد ہزاراں برگزشت
یکے گشت از سخن گوئی بپا      گفت کل الصید فی جوف الفرا
شاعران گشتند جیشے تاردحار      دیں سبارز کرد کار صد سوار

ادھر ایران کے مشہور نقاد آقائے داؤد شیرازی کے الفاظ میں:

"اقبال سبک و مکتب جدیدی در شعر فارسی تاسیس کردہ کہ حقا باید سبک اورا "سبک اقبال" نامید و قرن ادبی حاضرہ را باید بنام نامی ادمزین ساخت۔"

علامہ اقبال ہمہ جہت تخلیقی شخصیت کے حامل اور مشرق و مغرب کے فلسفیانہ تصورات کے رمز آشنا تھے۔ آج سے صدی پیشتر جب نوجوان اقبال کا تخلیقی شعور پختگی حاصل کر رہا تھا تو انگریزی تعلیم اور مغربی ثقافت کے بڑھتے اثرات کے باوجود یہاں پر فارسی زبان اور شاعری کا چرچا تھا، فارسی گو شعراء بھی تھے اور فارسی شعراء ادب کے دلدادہ بھی، سعدی کی حکایات سے درس اخلاق لیا جاتا تھا تو حافظ کی غزلیں محفلوں میں گائی جاتی تھیں جبکہ فردوسی، رومی، جامی اور عطار کے مداحین بھی تھے اور اسی "مفرس فضا" میں طالب علم اقبال نے پہلے فارسی زبان سیکھی اور پھر اس کے شعر و ادب سے تخلیقی آشنائی پیدا کی۔ یوں کہ عمر بھر فارسی زبان کے اسلوب اور اس کی جمالیات کے گرویدہ رہے۔ اقبال شاعر کے ساتھ ساتھ مفکر

بھی تھے۔ اس ضمن میں یہ امر بھی توجہ طلب ہے کہ یورپ جا کر انہوں نے ”فلسفہ عجم“ (Metaphysics of Iran) کے موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھ کر ۱۹۰۷ء میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ گویا وہ فارسی شاعری کے ”دل“ کے ساتھ ساتھ اس کے ”دماغ“ سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ انہوں نے یوں ہی تو رومی کو اپنا مرشد قرار نہ دیا تھا۔ ایرانی افکار سے ان کی دلچسپی بہت پرانی تھی۔

علامہ اقبال کے شاعرانہ اسلوب میں ”جلال“ کے ساتھ ساتھ ”جمال“ کی جو کیفیت ملتی ہے، وہ فارسی شاعری سے ان کی تخلیقی دلچسپی کی مظہر ہے۔ اسی طرح ایرانی تاریخ اور جغرافیہ کے ساتھ ساتھ ایرانی شعراء، شخصیات، اشعار کی تضمین اور تلمیحات بھی ملتی ہیں۔ بعض اوقات وہ ان پر اعتراضات بھی کرتے ہیں (جیسے حافظ) مگر اس کے باوجود ان کی اردو شاعری بھی بڑی حد تک ایرانی فضا کی حامل ہے۔ کبھی کبھی تو یوں محسوس ہوتا ہے گویا وہ فارسی میں سوچ کر افکار کو اردو اشعار کا جامہ پہنا رہے ہوں۔ بس یوں سمجھئے کہ علامہ اقبال کی شاعری میں ایرانی ثقافت نے بہتر اجزاء اور اردو فارسی زبان سے مخصوص جمالیاتی عناصر، تخلیقی سطح پر ترفع حاصل کر کے علامہ کی تخلیقی شخصیت میں گھل مل کر لازم و ملزوم ہو جاتے ہیں۔

اگر علامہ اقبال نے فارسی میں شعرگوئی نہ کی ہوتی تو مفکر مشرق اور تصور پاکستان کے خالق ہونے کے باوجود بھی وہ زیادہ سے زیادہ اردو دنیا کے بڑے شاعر ہوتے۔ فارسی کی بدولت ان کی زندگی میں بھی، ایران افغانستان کے ساتھ مغرب میں بھی ان کے نام اور کام سے دلچسپی لی جانے لگی اور اب تو خیر اقبال شناسی کی بین الاقوامی روایت بن چکی ہے جس کی تشکیل میں ان کے فارسی کلام نے کلیدی کردار ادا کیا۔

علامہ اقبال ـــــ جوانوں کو، پیروں کا استاد کرنے کے قائل تھے۔ اگر انہوں نے اردو میں ”خطاب بہ نوجوانان اسلام“ ”ایک نوجوان کے نام“ اور ”جاوید کے نام“ جیسی نظمیں لکھیں تو فارسی میں ایرانی نوجوانوں سے یوں خطاب کیا:

چوں چراغ لالہ سوزم در خیابان شما
اے جوانان عجم جان من و جان شما
غوطہ بازد در خمیر زندگی اندیشہ ام
تابدست آوردہ ام افکار پنہاں شما
مہر و مہ دیدم نگاہم برتر از پروین گشت
ریختم طرح حرم در کافرستان شما
تا سنانش تیزتر گرد و فرد پیچیدش
شعلہ آشفتہ بود اندر بیابان شما
فکر رنگینم کند تندد تہی دستان شرق
پارہ لعلے کہ دارم از بدخشاں شما
می رسد مردے کہ زنجیر غلاماں بشکند
دیدہ ام از روزن دیوار زندان شما
حلقہ گرد من زنید اے پیکران آب و گل
آتش در سینہ دارم از نیاگان شما

ان اشعار میں جذب کی جو گرمی نظر آتی ہے۔ وہ محض نوجوانوں تک ہی محدود نہیں بلکہ وہ نیک نیتی سے یہ سمجھتے تھے کہ سیاسی طور پر مضبوط ایران عالمی سیاست میں فعال کردار ادا کر سکتا ہے۔ ملاحظہ ہو یہ شعر:

طہران ہو گر عالم مشرق کا جنیوا
شاید کرۂ ارض کی تقدیر بدل جائے

ایران اور پاکستان کے ثقافتی، سیاسی، تخلیقی اور فکری روابط کے لیے اگر "پل" کی مثال دی جائے تو پھر یہ "پل" دو مضبوط ستونوں پر استوار نظر آتا ہے۔ ہمارے ہاں علامہ اقبال اور

ایران میں ڈاکٹر علی شریعتی۔ شاہ کے خلاف مزاحمت کی تحریک میں علی شریعتی کے فعال کردار' ان کی شعلہ بیانی' ان کے افکار و تصورات اور پھر لندن میں ۱۹؍ جون ۱۹۷۷ء کو پراسرار حالات میں ان کی موت سے سب آگاہ ہیں۔

علامہ اقبال سے علی شریعتی جو بطور خاص متاثر ہوا تو بنیادی وجہ اسلام اور قرآن مجید اور قانونی آزادی کی خواہش تھی۔ فرق اتنا ہے کہ اقبال کا وطن غیر ملکی سامراج کے زیر تھا جبکہ علی شریعتی کا وطن "اپنے" شاہ کے ظلم و جبر کا شکار تھا۔ علامہ اقبال کا فلسفہ بنیادی طور پر حرکی ہے اور وہ فکر و عمل کے داعی ہیں۔ یہی مقاصد علی شریعتی کے تھے۔ اس فکری مماثلت نے بھی شریعتی کو اقبال کا گرویدہ بنا دیا جس طرح علامہ اقبال کےلیے مولانا رومی نے مرشد کا درجہ حاصل کر لیا تھا۔ اس طرح علی شریعتی کےلیے علامہ اقبال نے معلم کا مرتبہ حاصل کر لیا۔ گویا اقبال نے اہل ایران سے جو "فکری قرض" حاصل کیا تھا' اسے انہوں نے علی شریعتی کی صورت میں مع سود واپس کر دیا۔

اگرچہ علمی حلقوں کےلیے ڈاکٹر علی شریعتی کا نام اب اجنبی نہیں' تاہم ان کے افکار و تصورات سے ابھی ۱۹۷۹ء میں جب "ایران میں اقبال شناسی کی روایت" مرتب کی تو اس میں دوست ڈاکٹر خواجہ حمید یزدانی سے علی شریعتی کی "ما و اقبال" کے کچھ اجزاء کا اردو ترجمہ کرایا۔ ۱۹۸۲ء میں ڈاکٹر محمد ریاض نے جزوی ترجمہ کیا اور ۱۹۹۴ء میں ڈاکٹر ظہور احمد اعوان نے نہ صرف مکمل ترجمہ کیا بلکہ "علی شریعتی اقبال شریعتی" کے نام سے علی شریعتی کے بارے میں کتاب بھی لکھی؛ جس سے پتہ چلتا ہے کہ علی شریعتی علامہ اقبال کو انتہائی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اقبال کے بارے میں علی شریعتی کہتے ہیں:

> "اقبال ایک عظیم ہستی تھا' جس نے سیاسی بیداری کے مشن کو درجہ کمال تک پہنچایا۔ علم و فلسفہ کے لحاظ سے وہ بڑی حیثیت کا حامل تھا' اہل مغرب اسے برگساں کے برابر کا فلسفی اور تاریخ اسلام

> اسے غزالی کے پائے کا دانشور سمجھتی ہے۔ وہ مولوی معنوی کا عاشق بھی ہے، اس کی روحانی دنیا کا ہم سفر بھی اور اس درد عشق کی آگ میں پگھلا ہوا گداز انسان بھی۔ مقام تشکر ہے کہ اقبال کرچی کرچی ہونے سے بچ گیا، خانوں میں نہ بٹا، عشق کیا مگر اس میں گم نہیں ہوا، ثابت و سالم کندن بن کر نکلا۔''

ایران اور پاکستان کے ثقافتی، تخلیقی اور ان کے ساتھ ساتھ سیاسی، تمدنی اور عمرانی روابط کی داستان طویل اور جمیل ہونے کے ساتھ ساتھ صدیوں پر محیط بھی ہے۔ جغرافیائی قربت اور فارسی زبان کے ثقافتی اور تخلیقی اثرات کے لیے محرک کا کام کرتی رہی۔ چنانچہ قدیم زمانے میں مختلف حکومتوں اور بادشاہوں کے باوجود اس خطہ کی عمارات، ملبوسات، آداب و رسوم خود و نوش اور آداب محفل تک پر ایرانی تہذیب و تمدن کے اثرات کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ کبھی یہ اثرات جزوی، مجمل اور خام محسوس ہونے میں اور یہ بھی ہے کہ بعض اثرات نے اپنی صورت کے برعکس نظامی تہذیب و تمدن کی مناسبت سے نیا روپ حاصل کر لیا ہو۔

وقت گزرنے کے ساتھ سے سیاسی حالات اور انگریزی عملداری کے نتیجہ میں اگرچہ اب یہاں تہذیبی و تمدنی اثرات پر زیادہ تر مغرب کی چھاپ نظر آتی ہے۔ مگر علمی ادبی اور تخلیقی سطح پر اب بھی فارسی زبان اور اس کے عظیم شعراء ہمارے لیے جانے پہچانے ہیں۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں فارسی کی تعلیم دی جا رہی ہے اور سعدی، حافظ، رومی، جامی ہنوز داخل نصاب ہیں۔ اور اس پر مستزاد بزرگوں کی کل کے ایسے اصحاب جو ابھی تک دیوان حافظ سے فال نکالتے ہیں، مائیکل جیکسن اور میڈونا کے دور میں یہ بھی غنیمت ہے۔ جب تک دیوان حافظ، مثنوی مولانا روم، حکایات سعدی اور علی شریعتی کے افکار موجود ہیں۔ ایران اور اہل ایران کے تخلیقی اثرات بھی موجود رہیں گے۔ یہیں نہیں، بلکہ کلام اقبال کی صورت میں خود ہم بھی اہل ایران کو جواب میں کچھ دینے کے قابل ہیں۔

## مآخذ:

براؤن، ایڈورڈ جی، پروفیسر: "تاریخ ادبیات ایران بعد مغولاں" دہلی، انجمن ترقی اردو، ۱۹۴۹ء

براؤن، ایڈورڈ جی، پروفیسر: "تاریخ ادبیات ایران" دہلی، انجمن ترقی اردو، ۱۹۳۹ء

رشید اختر ندوی: "ارض پاکستان کی تاریخ" لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۶ء

ظہور احمد اعوان، ڈاکٹر: "علی شریعتی اقبال شریعتی" پشاور، ادارۂ علم و فن، ۱۹۹۱ء

سید عبداللہ، ڈاکٹر: "ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ" دہلی، انجمن ترقی اردو، ۱۹۴۲ء

محمد اسحاق صدیقی: "فن تحریر کی تاریخ" علی گڑھ، انجمن ترقی اردو، ۱۹۶۲ء

محمد حسین آزاد: "سخن دان فارس" رامپور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۹۰ء

مقبول بیگ بدخشانی، مرزا: "ادب نامہ ایران" لاہور، نگارشات، سندھ

معین الدین احمد ندوی (مرتب): "ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی کارنامے" اعظم گڑھ، دارالمصنّفین، ۱۹۶۳ء

میر تقی میر: "نکات الشعراء" (مرتبہ ڈاکٹر عبادت بریلوی)، لاہور، ادارۂ ادب، تنقید، ۱۹۸۰ء

وحید قریشی، ڈاکٹر: "دلی اور ادبیات فارسی" لاہور، یونیورسٹی اورینٹل کالج، ۱۹۹۵ء

یحییٰ امجد: "تاریخ پاکستان، قدیم دور" لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۷ء

☆☆☆